Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پھر؟" "باسا تو اِدھر ہی ہے ناء۔ شہر میں لگ گیا ہے۔ اَپنے ہاتھ میں رکھے گا۔ پِھر ابا اُن کے سَر پر حاضر ہے۔ اُس کے سامنے کوئی پیر نہیں مار سکتا۔ تم اَپنے حیلوں کو چھوڑو۔ میں خُود جا کر ہل چلانے لگوں تو پِھر تمہیں چین آئے گا؟"

"ہاں،" اعجاز ہنسا۔ "مجُھے پِھر چین آئے گا۔ پہلے تو مجُھ سے ہل چلانا سیکھ۔ پِھر جا کر چلانا۔"

سکینہ نے اعجاز کے ہاتھ کو اَپنی پیٹھ پر ہولے ہولے ہلتے ہُوئے محُسوس کیا۔ وہ اَپنی جگہ پہ بیٹھی بیٹھی کسمسائی، گویا جسم کی رضامندی کا اِظہار کر رہی ہو۔ پِھر اُس نے تیزی سے بچوں کی چارپائیوں پہ نظر ڈالی۔ حسن اَور حسین کھلے آسمان تلے گہری نیند سو رہے تھے۔ سکینہ اعجاز کے ہاتھ سے نِکل کر اُٹھی اَور لڑکوں کی چارپائیوں پہ جھک کر احتیاط سے اُن کی چادروں کو، جنہیں لڑکوں نے نیند میں اُتار دیا تھا، سیدھا کر کے اُنہیں ڈھانپ دیا۔ جَب وہ لوٹی تو ہنسی سے دُہری ہو رہی تھی۔

"کیا بات ہے؟" اعجاز نے پُوچھا۔

"حسینے کا۔۔۔۔ حسینے کا۔۔۔۔" آواز دبانے کی کوشش میں اُس کے مُنہ سے ہنسی کے مارے بات نہ نِکل رہی تھی۔

"کوئی بات تو بتا، بس ہنسے جا رہی ہے۔ تیرا سَر پھر گیا ہے؟"

"حسینے کا بدن اُٹھا ہوا ہے۔" وہ بولی۔

اعجاز کی ہنسی نِکل گئی۔ اُس نے سَر اُٹھا کر سوئے ہُوئے لڑکوں کی جانب دیکھا، مگر اندھیرے میں اُسے کچھ نظر نہ آیا۔ اُس نے سکینہ کو کھینچ کر اَپنے ساتھ لٹا لیا۔

"شرم کر،" سکینہ ہنسی دباتے ہُوئے سرگوشی میں بولی، "لڑکے جوان ہو رہے ہیں۔"

"ٹھیک ہے ناء، جلدی جوان ہو جائیں تو تسلی سے اَپنے کام میں لگ جاؤں۔"

"تجھے تو بس دو ہی کام ہیں۔ گھر آتے ہو تو میری سختی لے آتے ہو۔۔۔۔"

"سختی تو میرے اندر ہے،" اعجاز اَپنے بدن پر ہاتھ مار کر بولا، "تیرے اندر تو نرمی ہی نرمی ہوتی ہے۔"

"اَور باہر جا کر اَپنی افسری میں لگے رہتے ہو۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"افسری کہاں کی؟" اعجاز اُس کے جسم پہ ہاتھ پھیرتے ہُوئے بولا، "میرا اپنا آدمی مشکل میں ہے اَور میں اُس کی جان نہیں چھڑا سکتا۔"

"کون ہے؟"

"منظور کا بھائی۔ اُسے پولیس نے پکڑ کر حوالات میں رکھا ہوا ہے۔"

"اُس نے کوئی گناہ کیا ہو گا۔"

"اونہوں۔ ایک پولیس افسر کا نوکر تھا۔ اُس نے چوری کا الزام لگایا ہے۔"

"تُم اِس کام کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟"

اعجاز نے ٹھنڈی سانس بھری۔ "آسان بات نہیں۔ عزت کا سوال ہے۔ چل چھوڑ اس قصے کو۔۔۔۔"

سکینہ کا جسم ڈھیلا پڑ چکا تھا۔ یہ مردنی کا ڈھیلا پن نہیں، جانداری کا پھیلاؤ تھا جِس سے گوشت میں نرمی آ گئی مگر پٹھوں کا تناؤ اُبھر آیا تھا۔ یہ گوشت اَور پٹھوں کا میلان تھا جو مرد کو چند لمحوں کے لِئے دُنیا کے ہر تردد سے آزاد کر دیتا ہے۔ رات آدھی کے قریب نِکل چکی تھی۔ جیٹھ کی تند لُو میں حلاوت آ گئی تھی۔ پسینے سے شرابور جسموں پہ ہوا کے جھونکے رگڑ کھاتے ہُوئے گزُرے تو دونوں کو ٹھنڈک کا میٹھا میٹھا احساس ہوا۔ سکینہ کا حلق لذت آمیز کراہیں روکنے کی کوشش میں خشک ہو رہا تھا۔

"آندھی اُٹھ رہی ہے،" اُس نے پھٹی ہُوئی سی آواز میں سرگوشی کی۔

اعجاز نے کوئی جواب نہ دیا۔

"ہوا ٹھنڈی ہے۔ کہیں مینھ برسا ہے۔ سو گئے ہو؟"

"ہوں،" اعجاز نے نیند میں حلق سے آواز نکالی۔

"ملک بھینگر کا بیٹا سنا ہے واپس آ گیا ہے۔"

"تجھے بھی اَیسے وقت کیسی کیسی باتیں سوجھتی ہیں،" اعجاز نے کہا۔ "چپ کر کے سو جا۔" سکینہ نے اعجاز کی چادر کا آدھا پلو اَپنے جسم پہ اوڑھا اَور بازو اعجاز کی چھاتی کے گِرد لپیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔

اُجالا ہونے سے پہلے سکینہ اُٹھ کر اپنی چارپائی پہ گئی اَور چادر لپیٹ کر سو گئی۔ مغرب کی طرف سے کالی آندھی چڑھ رہی تھی جِس نے آسمان کو تاریک کر دیا تھا۔ ہاتھ کو

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہاتھ بجھائی نہ دیتا تھا۔

اعجاز تھانیدار چوہدری شریف بھٹی کے پاس بیٹھا تھا۔

"اعجاز، تیرا یونین کا کام مَیں نے کتنا کیا ہے، بتا؟ جب کسی مِل مالک نے مزدور پہ ظلم کیا، جب کسی مزدور کا دُوسرے سے جھگڑا ہوا، کتنی رپٹیں تیرے لِئے میں نے پھاڑی ہیں، کبھی اِنکار کیا ہے؟"

"کبھی نہیں، چوہدری صاحب، میرے اُوپر آپ نے ہمیشہ خاص مہربانی کی ہے۔ اِسی لِئے تو میں اعتماد لے کر آ جاتا ہُوں۔ آپ جیسے مہربان افسر روز روز پیدا نہیں ہوتے۔"

"مگر یہ آدمی تو تیری کسی یونین کا بھی نہیں، ایک نجی نوکر تھا۔"

"یہ آدمی بے قصور ہے چوہدری صاحب۔ اس نے چوری نہیں کی۔ کوئی نہ کوئی چیز کہیں نہ کہیں سے تو نکلتی۔ آپ نے اِس کے سات رشتے داروں عزیزوں دوستوں کے گھروں کی تلاشی لے لی ہے۔ میں ایک عام شہری کی حیثیت سے اِنصاف مانگنے آیا ہُوں۔ آپ انصاف کے پاسبان ہیں۔"

"انصاف کی بات چھوڑ اعجاز۔ انصاف کو آج کون پُوچھتا ہے۔ میرے ساتھ کیا انصاف ہو رہا ہے؟" اُس نے بازو لمبا کر کے کھڑکی سے باہر اشارہ کیا۔ "اِس سارے علاقے کو دیکھ رہے ہو؟"

"دیکھ رہا ہُوں۔"

"کتنا علاقہ ہے؟"

"بہت بڑا علاقہ ہے۔"

"میں اِس علاقے کا مالک ہوں،" تھانیدار نے کہا۔ "میری تنخواہ ڈھائی سو روپے ہیں۔ الونس ملا کر پونے چار سو بنتی ہے۔ میں پونے چار سو میں اِس سارے علاقے کو کنٹرول کر سکتا ہوں؟"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"چوہدری جی، آپ کی عزت، آپ کا اختیار، اس کی تو کوئی قیمت ہی نہیں۔"

"اوئے عزت اختیار کو چھوڑ۔ یہ دو ستارے جو میرے مونڈھے پر لگے ہُوئے ہیں کیا میرا پیٹ بھرتے ہیں؟"

"جہاں تک تنخواہ کا معاملہ ہے، ہماری حکومت نے سرکاری ملازمین کی تنخواہیں بڑھانے کا وعدہ کیا ہوا ہے۔"

"حکومت کے وعدے مجھے مت بتا۔ میں کچی گولیاں نہیں کھیلا ہوا۔ سپاہی بھرتی ہوا تھا، تیس سال سے حکومتوں کے وعدے سن رہا ہُوں۔ جہاں تک اِس کیس تعلق ہے، یہ میرے ہاتھ سے باہر ہے۔ ڈی۔ایس۔پی صاحب کا ملازم تھا۔ اُن کے ہاتھ میں سب کچھ ہے۔"

"چوہدری صاحب،" اعجاز نے کہا، "سب جانتے ہیں کہ شہر کا مالک ایس۔پی ہوتا ہے اَور علاقے کا مالک ایس۔ایچ۔او۔ بس۔ قصہ ختم۔ ڈی۔ایس۔پی صاحب آپ کا کہنا کیسے موڑ سکتے ہیں؟"

"تو میری نوکری کے پیچھے پڑا ہے؟ مجھے اُلٹے رستے پر مت لگا۔ میری ریٹرمنٹ قریب ہے۔ ڈپٹی صاحب نے میری گانڈ میں ہاتھ دیا ہوا ہے۔ میرے افسر ہیں۔ دیکھ میں تجھے بتاتا ہُوں۔ باقر شاہ کو ڈپٹی صاحب کے پاس لے جا اَور اُن کی منت کر۔ یہی ایک طریقہ ہے۔"

"درست ہے۔ میں ایسا کرتا ہُوں۔ مگر ریاض کے ساتھ ذرا نرمی اختیار کریں۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔"

"نرمی ہی نرمی ہے۔"

"کوئی پرچہ تو درج ہوا نہیں، نہ رپٹ لکھی گئی ہے۔"

"پرچہ اُس وقت ہو گا جب ہمیں ثبوت ملے گا۔"

"ثبوت چوہدری صاحب موجود ہی نہیں ہے۔ وہ چوری کا مرتکب ہی نہیں ہوا۔"

"ثبوت حاصل کرنا ہمارا کام ہے۔ تو میری بات مان، جیسا میں نے کہا ہے وَیسا کر۔"

باقر علی شاہ اَپنے کمرے میں آنکھیں میچے، سَر پہ پٹی باندھ کر لیٹا ہوا تھا۔ ایک نوکر اُس کی ٹانگیں دبا رہا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"کیا حال ہے، شاہ صاحب،" اعجاز نے پُوچھا۔

"کیا حال پُوچھتے ہو ملک اعجاز، کوئی ایک چیز ہو تو بتاؤں۔ بلڈ پریشر، گُردے کی تکلیف، اُوپر سے لو لگ گئی ہے۔ آج چھ دِن ہو گئے ہیں، بستر سے نہیں اُٹھا، ڈاکٹر نے مکمل آرام کا مشورہ دیا ہے۔"

وہاں سے مایوس ہو کر اعجاز مختار ڈوگر کے پاس پہنچا۔

"کیا کہا؟ چھ دِن سے بستر پر پڑا ہے؟" مختار ڈوگر نے آسمان کی جانب دیکھ کر ہاتھ باندھ دیئے، "اللہ میری توبہ، سید کی ذات اَور اِتنا بڑا جھوٹ! ابھی ابھی شفیع لوہار کے بیٹے کا ولیمہ کھا کر آیا ہے۔ میرے ساتھ کھڑا تھا۔" پھر وہ آگے جھک کر راز داری سے بولا، "اصل میں لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے۔ کسی کے ساتھ اُٹھ کر تھانے تک نہیں جاتا۔ اپنے حواریوں کے ذریعے افواہ پھیلا رکھی ہے کہ اُسے وزارت ملنے والی ہے، پھر سب کے کام ہو جائیں گے۔ میں تو ملک اعجاز ہر کسی کے ساتھ اُٹھ کر اپنی جیب سے پیسے خرچ کر کے کچہری تک جاتا ہُوں۔ اللہ شاہد ہے، تم کہو تو ہائی کورٹ تک تمہارا ساتھ دوں گا۔ مگر یہ رفیق ڈی۔ ایس۔ پی بڑا کتا افسر ہے۔ میں ایک دو دفعہ لوگوں کے کام کے لئے گیا ہُوں۔ اب تو وہ مجُھے ملنے کا وقت بھی نہیں دیتا، میری شکل دیکھ کر نہ کر دیتا ہے۔ تمہارے ساتھ میں چلا گیا تو اُس نے اگر کام کرنا بھی ہوا تو مجُھے دیکھ کر نہ کر دے گا۔ میری صلاح مانو تو اکیلے ہی چلے جاؤ۔ شاید کوئی دید لحاظ کر دے۔ آخر تمہاری اپنی حیثیت بھی کوئی کم نہیں۔ سارا زمانہ تمہیں جانتا ہے۔ وَیسے تمہیں بتاؤں،" وہ اعجاز کے بازو پر ہاتھ رکھ کر بولا، "چغلی کی بات نہیں، باقر شاہ اگلے روز بھی کہہ رہا تھا، کہتا تھا ملک اعجاز کی اصل طاقت منظور ہی ہے۔ ساری بھاگ دوڑ وہی کرتا ہے۔ منظور کو ہٹا دو تو اعجاز زیرو بھی نہیں رہ جاتا۔ چغلی کی بات نہیں، میں تمہیں بتاتا ہوں، یہ آدمی سانپ ہے سانپ۔ اِس پر اِعتماد کرنا چوداں کا گھاٹا ہے۔ آگے تمہاری اپنی عقل ہے۔ ہمارا کام تو صِرف وارننگ کرنا ہے۔"

اعجاز اَپنے دفتر میں واپس آیا تو اُس کے چہرے پہ افسردگی تھی۔ کرسی پہ منظور سَر کو دونوں ہاتھوں میں تھامے میز پر جھکا ہوا تھا۔

"نااُمید ہونے کی ضرورت نہیں بھورے۔ دیکھ ابھی دوڑ بھاگ کر رہے ہیں۔ کوئی نہ کوئی صورت نِکل آئے گی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

منظور نے جواب دیئے بغیر مایوسی سے نفی میں سر ہلایا اور اُسی طرح بیٹھا رہا۔

ڈیرسٹ چھیمی۔ تمہارے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ تم نے دو خط اور لالے نے دو خط الگ الگ لکھے ہیں۔ مجھے تمہارا صرف ایک خط ملا ہے اور لالے کا کوئی خط نہیں ملا۔ میں نے تمہیں لکھا تھا کہ یہ چور جو ہمارے جیلر بنے ہوئے ہیں زیادہ خط و کتابت کو روک لیتے ہیں۔ یہ سن کر مجھے بیحد خوشی ہوئی کہ تم اور لالہ اور سب لوگ ٹھیک ٹھاک ہو۔ اب ہم لوگ نسبتاً آرام کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جون جولائی میں گرمی سے جان پر بنی ہوئی تھی۔ آس پاس کوئی سایہ نہیں اور سیمنٹ کی بیرکیں تندور کی طرح تپ جاتی تھیں۔ کچھ کھانے کو ویسے ہی جی نہیں کرتا۔ نیم گرم پانی پی پی کر پیٹ "آپھر" گیا تھا۔ اب بارشیں شروع ہوئی ہیں تو تھوڑا بہت چین آیا ہے۔ تمہارے خط سے معلوم ہوا ہے کہ میرا خط پہنچنے میں دو تین مہینے لگ جاتے ہیں، اِس لِئے جب یہ خط تمہیں ملے گا تو اُس وقت تک سردیاں شروع ہو چکی ہوں گی۔ یہ مہینے میں دو خطوں کی اجازت جو ہمیں اُنہوں نے دے رکھی ہے سب فراڈ ہے۔ میں تمہیں بیس سے زیادہ خط لکھ چکا ہوں۔ مگر تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ تمہیں صرف چار خط ملے ہیں۔ سب سے اچھی خبر یہ ہے کہ دو ہفتے پہلے ریڈ کراس کے آدمی کیمپ کا معائنہ کرنے آئے تھے۔ اُس روز ہماری چارپائیوں پر صاف چادریں بچھیں اور صفائی ہوئی، میزوں پر اخباریں رکھ دی گئیں اور اصلی گوشت کا سالن پکا۔ کچھ گورے تھے اور دو افریکن کالے تھے۔ ہم نے اپنی شکایتیں پیش کیں۔ بتایا کہ تین وقت ریت والی روٹی اور مویشیوں کو کھلانے والے دانوں کا شوربہ جسے یہ بنیئے دال کہتے ہیں، کھانے کو ملتا ہے۔ مطالبات پیش کئے۔ مہینے میں چار خط لکھنے کی اجازت ہونی چاہیئے۔ ہفتے میں تین بار گوشت پکے جو گوشت ہو چھیچھڑے نہ ہوں۔ باقاعدگی سے ہمارا میڈیکل ٹیسٹ ہو اور ہر ہفتے ہمارا وزن کیا جائے، وغیرہ وغیرہ۔ جس مستعدی سے وہ ہماریں باتیں نوٹ کر رہے تھے اُسے دیکھ کر ہمارے دِلوں میں اُمید کی کرن

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

پیدا ہوئی، مگر اُس کے پیچھے ایک مستقل نااُمیدی کا احساس کہ یہ لکھ لکھا کر چلے گئے تو کچھ بھی نہیں ہو گا۔ چنانچہ وہی ہوا جس کا خدشہ تھا۔ کوئی شکایت رفع نہ کی گئی۔ ہم ریڈ کراس کو خط لکھتے ہیں تو یہ حرامی اُسے روک لیتے ہیں۔ ہاں، البتہ ایک بہت بڑی امپرووومنٹ ہو گئی ہے۔ ہماری سب سے پہلی شکایت گرمی کی تھی اور مطالبہ تھا کہ ہمیں بجلی کے پنکھے لگوا کر دیئے جائیں، ورنہ ہم اِن بیرکوں میں جل بھن کر مرمرا جائیں گے۔ یہ ایک ہی چیز تھی جس کا اُن لوگوں کو فرسٹ ہینڈ تجربہ ہوا تھا۔ دو گوروں نے سفید کاٹن کی قسم کے کپڑے کے سوٹ پہنے ہُوئے تھے اور ٹائیاں لگا رکھی تھیں۔ پسینے سب کو آ رہے تھے، مگر سوٹوں والے گوروں کی تلملاہٹ دیکھنے والی تھی۔ اُن کا پسینہ بنیانوں اور قمیضوں سے نِکل کر کوٹوں کو گیلا کر رہا تھا۔ وہ بار بار ٹائیوں میں پھنسی ہوئی گردنوں سے کالر ڈھیلے کر کے رومال سے خشک کر رہے تھے۔ چنانچہ اور تو کچھ نہ ہوا، ہماری چھتوں پر پنکھے لگ گئے۔ پنکھے گرم ہوا پھینکتے تھے، پچھلے ہفتے بارشیں شروع ہوئیں تو ان کی ہوا ہی غائب ہو گئی ہے۔ مگر اُنہیں دیکھ دیکھ کر ہی کچھ نہ کچھ تسلی ہو جاتی ہے۔ اِن پنکھوں نے البتہ ایک ایسا کام دکھایا جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔ اب ہنسا مت، یہ ایک سچی داستان ہے جو ہم عمر بھر (جو بھی "عمر بھر" آئے گی) لوگوں کو سناتے رہیں گے۔ ہوا یہ کہ کل ایک قسمت کی ماری چڑیا، عام سی چڑیا جو گھروں میں ہوتی ہے، ہمارے کمرے میں آ گئی۔ دیواروں کے ساتھ اِدھر اُدھر اڑتی ہُوئی بیچاری گھومتے ہُوئے پنکھے کے پروں سے ٹکرا گئی اور زخمی ہو کر پھڑپھڑاتی ہُوئی فرش پر گر پڑی۔ لفٹننٹ فضل نے ایک جست میں چڑیا کو جا دبوچا۔ ہم چھ کے چھ آدمی کئی منٹ تک آپس میں مشورے کرتے رہے کہ اِس کا کیا جائے۔ کسی نے کہا اِسے میدان میں چھوڑ دیں، یہاں کوئی کتا بلی تو ہے نہیں جو اسے کھا جائے گا، اِس کا زخم خُود ہی مندمل ہو جائے گا۔ دُوسرا بولا کہ ہم خُود ڈسپنسری سے ٹنکچر وغیرہ مانگ کر اس کا علاج کریں اور اِسے میسکاٹ کے طور پہ اَپنے پاس رکھ لیں۔ کسی نے کچھ کہا، کسی نے کچھ۔ ننھی سی چڑیا جس کے ایک کندھے سے خُون بہہ رہا تھا، فضل کے ہاتھ میں دبکی بیچارگی کی نظروں سے خلا میں دیکھتی رہی۔ آخر میجر شاہ زمان نے ہاتھ بڑھا کر فضل سے چڑیا لے لی اور باہر کو چل پڑا۔ ہم سب لاعلمی کی حالت میں اُس کے پیچھے پیچھے ہو لئے۔ شاہ زمان سیدھا ہمارے باورچی کے پاس پہنچا، اُس سے چھُری مانگ کر زمین پہ بیٹھا، اور پیشتر

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

اِس کے ہم میں سے کوئی مُنہ کھولتا، شاہ نے بسم اللہ اللہ اکبر پڑھ کر چڑیا کو ذبح کر دیا۔ چڑیا کے گلے سے اِتنا خُون بھی نہ نِکلا کہ چھری کا پھل ہی گیلا ہو۔ وہ پھڑپھڑا کر ساکت ہو گئی۔ شاہ زمان نے وہیں بیٹھے بیٹھے احتیاط سے اُس کے پر نوچ کر اُسے ننگا کیا اَور باورچی کو پکڑا دیا۔ باورچی نے اُسی چھری سے اُس آدھے انگوٹھے جتنے پرندے کا قیمہ کیا اَور رات کو دال میں ملا کر پکانے کو ایک طرف رکھ دیا۔ ہم سب کے دِل میں چڑیا کے ذبح ہونے پر افسوس کے ساتھ ساتھ یہ بھی احساس تھا کہ چڑیا کا بہترین مصرف یہی تھا۔ جب سالن پک کر آیا تو اُس میں گوشت مکمل طور پہ گھل چکا تھا۔ وہی موٹھ کی دال کے پانی بھرے بلبلوں کا لمبا شوربہ تھا اَور پرندے کا نام و نشان نہ تھا۔ میرے دانت میں ایک باریک تیلا سا آیا تھا۔ میں نے نکال کے دیکھا تو مُجھے وہ چڑیا کی کوئی ہڈی دکھائی دی۔ یا ہو سکتا ہے یہ میرا واہمہ ہی ہو۔ سالن کے ذائقے میں ذرہ برابر فرق نہ آیا تھا۔ مگر ہم نے گوشت کے تصور میں زیادہ ذوق شوق سے کھانا کھایا----

یہاں پہنچ کر سرفراز کا جی اُس کا ساتھ چھوڑ گیا۔ اُس کی طبیعت ایسی خراب ہُوئی کہ وہ میدان میں نِکل کر چند منٹ تک ٹہلتا رہا۔ کئی لمبے لمبے سانس لینے کے بعد واپس آ کر اُس نے قلم کے اصلی سرے سے کارڈ پر، جِس کے اُوپر پرنٹ تھا: کیمپ ۹۸۔ بھارت، اپنے پچیس لفظ لکھنے شُروع کیے۔

"ڈیئر سٹ پھپھی۔ میرا جو بھی خط تمہیں ملے وہ لالے کو ضرور پڑھا دیا کرو۔ میں بالکل ٹھیک ٹھاک ہُوں۔ مُجھے کوئی تکلیف نہیں۔ تمہارا۔ سری۔"

ایک روز صبح نو بجے سب کو میدان میں جمع ہونے کا حکم ملا۔ "کیا قصہ ہے؟" سرفراز نے کیپٹن عزیز سے پُوچھا۔

"پکی خبر نہیں، مگر سنا ہے کوئی انڈین مسلمان وعظ کرنے آ رہا ہے۔"

چھوٹی چھوٹی قینچی سے کتری ہُوئی سفید ہموار ڈاڑھی والا ساٹھ پینسٹھ برس کا آدمی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہاتھ میں چند اخبار لیے ہوئے آیا۔

"بسم اللہ الرحمٰن الرحیم،" وہ بولا۔ "میرا نام بدرالدین ہے۔" اُس نے رُک کر اَپنے سامنے چارپائیوں اَور کرسیوں پر بیٹھے اَور اِدھر اُدھر کھڑے ہوئے لوگوں پر نظر دوڑائی۔ "میں یونیورسٹی میں اِکنامکس اَور پولیٹکل سائنس کا اُستاد ہوں۔" اُس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی اخباریں کھولیں۔ اخباروں کے نام "سٹیٹسمین" اَور "ہندوستان ٹائمز" دکھائی دیئے۔ پھر اُس نے اندر کے کچھ ورق سامعین کے سامنے پھیلائے۔ اگلی رو میں بیٹھے ہوئے سرفراز نے اخبار کے صفحے پر موٹے اَلفاظ پڑھے:

PROBLEM - SOLVING BETWEEN INDIA AND PAKISTAN, BY BADRUDDEN CHAUDRI.

"میں اَپنے تئیں کئی برس سے ذرائع ابلاغ کے ذریعے اَپنے دونوں ملکوں کے مابین برادرانہ تعلقات اُستوار کرنے کی سعی کرتا رہا ہوں۔ مجھے آج آپ لوگوں سے ملنے کا موقع پا کر اِنتہائی خوشی ہوئی ہے اَور ساتھ ہی دُکھ بھی ہوا ہے۔ جن حالات میں ہم ایک دوسرے سے مل رہے ہیں وہ دُکھ دینے والے حالات ہیں۔ ہمارے مُلک صدیوں تک اکٹھے رہے ہیں، ہماری تاریخ مشترک ہے۔ ہم نے اِس برصغیر پر بیرونی حملہ آوروں کی بیسیوں یلغاریں ایک ساتھ سہی ہیں۔ ہماری زُبانوں میں تھوڑا بہت فرق ہو سکتا ہے، مگر ہمارے رسم و رواج ایک ہیں اَور سینکڑوں برس سے چلے آ رہے ہیں۔ یہی ہماری اصل تہذیب ہے۔ آج کی دنیا میں مذہبی نظریاتی ریاست کا تصور ناقابل عمل ہو چکا ہے۔ بھارت میں مسلمانوں کی تعداد پاکستان کے مسلمانوں سے زیادہ ہے۔ اَور سب سے زیادہ مسلمان انڈونیشیا میں بستے ہیں۔ چنانچہ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک تو اسلامی ریاست ہے اَور دوسری نہیں ہے؟ دراصل مذہبی نظریاتی ریاست کا دَور گزر چکا ہے۔۔۔۔"

کیپٹن عزیز جو سرفراز کے پہلو میں بیٹھا بیتابی سے پہلو بدل رہا تھا، آخر ضبط نہ کر سکا۔ "واٹ اباؤٹ اِسرائیل؟" وہ بولا۔

"یس، واٹ اباؤٹ اِٹ؟" بدرُالدین نے خطیبانہ اَنداز میں کہا۔ "وہاں کیا ہو رہا ہے۔ آپ نے بات میرے مُنہ سے چھین لی ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ بیس پچیس برس سے خُون خرابہ ہو رہا ہے۔ تاریخ میری بات کو صحیح ثابت کرتی

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ہے۔ مذہبی نظریاتی ریاست فساد کا گھر ہے۔"

"مگر ایک سیکولر ریاست نے اسرائیل کی بنیاد ڈالی،" کیپٹن عزیز نے جواب دیا۔ "اور دوسری سیکولر ریاست اِسے سپورٹ کر رہی ہے۔ یہ دوغلہ پن نہیں تو کیا ہے؟ کیا آپ تسلیم کرتے ہیں کہ اِنہی سیکولر ریاستوں نے مشرق وسطیٰ میں فساد کی جڑ ڈالی ہے؟"

"آپ کا پوائنٹ کسی حد تک صحیح ہو سکتا ہے، مگر یہ ایک الگ اَور وسیع المنظر سوال ہے جس میں داخل ہو کر ہم وقت ضائع نہیں کرنا چاہتے۔ ہمارے اَپنے مسائل توجہ طلب ہیں۔"

"ہمارے کوئی مسائل نہیں ہیں،" عقب سے ایک افسر نے جذباتی آواز میں کہا۔ "صرف ایک مسئلہ ہے، کہ ہندوستان نے پاکستان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا، جس کا ثبوت آج مل چکا ہے۔ اَور اَپنے آپ کو صحیح ثابت کرنے کے لِئے آپ جیسے منافقوں کی خدمات خریدی جا رہی ہیں۔"

بدرالدین چوہدری کا رنگ زرد پڑ گیا۔ ایک گارڈ دھمکی آمیز اَنداز میں بولنے والے افسر کی جانب بڑھا، جس کو اُس کے دُوسرے ساتھیوں نے کھینچ کر بٹھا دیا۔ بدرالدین نے کچھ کہنا چاہا، مگر ایک دو بار ہکلا کر رہ گیا۔ وہ دوبارہ بات شُروع کرنے کے لئے اَپنے آپ کو تیار ہی کر رہا تھا کہ افسروں کے مجمعے میں جگہ جگہ سے "غدار، ٹریٹر، گو بیک،" کی آوازیں اُٹھنے لگیں۔ گارڈ مستعد ہو گئے۔ اُنہوں نے صورتِ حال جانچ کر بدرالدین کو نرغے میں لیا اَور اُسے واپس لے چلے۔ اُن کے جانے کے بعد پندرہ بیس افسر غصے کی حالت میں میدان کے اندر کھڑے باتیں کرتے رہے، پھر بکھر کر اَپنی اَپنی بیرک میں چلے گئے۔

"سر آپ کو بولنا نہیں چاہئے تھا،" سرفراز نے کیپٹن عزیز سے کہا۔

"میں نے ایک مناسب سوال کیا تھا۔ اِس میں کوئی حرج نہیں تھا۔"

"یہ بات نہیں سر،" سرفراز نے آواز نیچی کر کے کہا۔ "ایسکیپ سکیم کی کامیابی کے لِئے ضروری ہے آدمی کسی کی نظروں میں نہ آئے۔"

"ہاں یار، تمہاری یہ بات تو درست ہے۔ مگر اُس وقت مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا۔ آئی شُڈ بھی مور کیئر فل اِن فیوچر۔ تھینکس۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مختار ڈوگر، ایم پی اے، اعجاز کے دفتر میں داخل ہوا۔

"ملک اعجاز، مدد کی ضرورت ہے،" وہ پریشانی میں بولا۔

"کیا بات ہے؟" اعجاز نے تھکے ہُوئے لہجے میں پُوچھا۔

"کل جلسہ ہے اَور بولنے والوں کی ماں مر گئی ہے۔"

"کیا ہوا؟"

"کوئی بیمار پڑ گیا ہے، کوئی کراچی چلا گیا ہے، کسی کو کوئی اَور بہانہ مل گیا ہے۔ میں اکیلا رہ گیا ہُوں۔ اب تم ہی میرے جلسے کو بچا سکتے ہو۔"

"باقر شاہ کہاں ہے؟"

"اُس کا کیا پُوچھتے ہو، وہ کبھی میرے جلسے میں آیا ہے؟ وہ گھر بیٹھا دعا مانگ رہا ہو گا کہ میرا جلسہ فیل ہو جائے۔"

"میں تو کل صبح وکیل کے پاس جا رہا ہوں مختار۔ منظور کے بھائی کی بلاجواز نظربندی کی درخواست کے لئے۔۔۔۔"

"گیارہ بجے تک فارغ ہو جاؤ گے۔ مشورہ ہی تو کرنا ہے ناء؟"

"وکیلوں کا تمہیں پتا ہے، نو بجے ملیں یا بارہ بجے۔ وعدہ نہیں کر سکتا۔"

"ملک اعجاز، میں آٹھ مہینے میں پہلی غرض لے کر تیرے پاس آیا ہُوں۔ تم وہاں کھڑے ہو جاؤ تو جلسے کو باندھ سکتے ہو۔ میں اکیلا وہاں کیا باں باں کروں گا۔ جلسہ فیل ہو گیا تو،" اُس نے اَپنائیت سے اعجاز کا ہاتھ پکڑا اَور لمبے لمبے دانت نکال کر مُسکرا دیا، "میری جان، ہم سب کی بے عزتی ہے۔"

"مختار، ایک بات بتا،" اعجاز تلخی سے بولا، "میں تجھے آج یاد آیا ہُوں۔ جب جلسے کا انتظام کیا، بولنے والوں کا بندوبست کیا، اُس وقت میں کہاں تھا؟ میں تجھے بتاتا ہوں کہ میں کہاں تھا۔ میں یہیں پر بَیٹھا تھا۔"

"حاشا وکلا، اعجاز، دو دفعہ یہاں سے میں پھر کر گیا ہُوں۔ ہر دفعہ پتا چلا کہ منظور کے

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

ساتھ تھانے گئے ہُوئے ہو۔"

"مجُھے کوئی اطلاع نہیں ملی،" اعجاز نے ناگواری سے مُنہ پھیر لیا، گویا کہہ رہا ہو، جھوٹ بولتے ہو۔

"اب اِس میں میرا تو کوئی قصور نہیں۔ چل جو ہو گیا سو ہو گیا۔ اب میری عرض کے آگے اِنکار نہ کر۔ تو چاہتا ہے کہ تیرے آگے ہاتھ جوڑوں، پیر پکڑوں؟"

"کوشش کروں گا۔ وعدہ نہیں کر سکتا،" اعجاز نے کہا۔

"میں کل صبح اَپنا آدمی بھیج دوں گا، وہ تجُھے موٹر سائیکل پر بٹھا کر کچہری لے جائے گا، تیرے ساتھ رہے گا، واپس بھی لے آئے گا۔ ٹھیک ہے؟"

اعجاز نے کوئی جواب نہ دیا تو مختار ڈوگر نے اعجاز کا ہاتھ دبا کر چھوڑ دیا اَور اُٹھ کر جاتے جاتے بولا، "بس ٹھیک ہے۔ کل سویرے آدمی یہاں موجود ہو گا۔"

اگلے روز صبح سویرے اعجاز اَپنے دفتر میں سُن بَیٹھا تھا۔ ایک آدمی افسردہ سی شکل لِئے میز کے پاس کھڑا تھا۔ چوہدری مختار ایک نوجوان کے موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھا آ پہنچا۔

"یہ مقبول احمد میرا بہترین ورکر ہے،" مختار ڈوگر نے تعارف کراتے ہُوئے کہا۔ "مقبول، تو مَلک اعجاز کو جانتا ہی ہے۔ آج سارا دِن تیری ڈیوٹی اِن کے ساتھ ہے۔" پِھر وہ اعجاز سے مخاطب ہوا۔ "مقبول کچہری کے سارے رستے جانتا ہے۔ کئی وکیلوں سے بھی واقفیت ہے۔"

"کچہری جانے کی ضرورت نہیں،" اعجاز نے کہا۔

"ضرورت نہیں؟ یہ تو بڑا اچھا ہوا۔ کیوں، کام ہو گیا؟"

"ہاں۔ منظور کا بھائی رہا ہو کر گھر آ گیا ہے۔"

"مبارک ہو۔"

"مبارک ہو؟" اعجاز گرج کر بولا۔ "مبارک ہو؟ اُس کا دماغ اُلٹ گیا ہے۔"

"کیوں؟ کیسے؟" مختار ڈوگر نے پُوچھا۔

"تشدد سے، اَور کیسے؟"

"اُفوہ! اُفوہ! اللہ معاف کرے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"اللہ کا اِس سے کیا تعلق ہے؟" اعجاز نے کہا۔ "یہ بندے کا کام ہے۔ یہ عوام کی حکومت میں عوام کا کام ہے۔" وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ "تم جاؤ مختار۔ میں منظور کے گھر جا رہا ہُوں۔ جلسے پر آ جاؤ نگا۔"

مختار ڈوگر بیٹھا اُس کا مُنہ دیکھتا رہا۔

"آج میرا بھی بات کرنے کو جی چاہ رہا ہے،" اعجاز جاتے جاتے بولا۔

پنڈال لگا تھا۔ ڈھائی تین سو کے لگ بھگ کا مجمع تھا۔ دوپہر کی دھوپ میں لوگ شامیانے کے سائے میں ایک دُوسرے کے ساتھ لگ کر بیٹھے تھے۔ سٹیج پر چار پانچ کرسیاں تھیں جن پر معمولی قسم کے لوگ بیٹھے تھے۔ کناتوں کے پیچھے مختار ڈوگر کی چاولوں کی دیگیں چڑھی تھیں جو جلسے کے بعد سامعین میں تقسیم کی جانے والی تھیں۔ بارہ بجے کے قریب اعجاز وہاں پہنچا تو ایک نوجوان نعت پڑھنے کے بعد چھوٹی موٹی تقریر کر کے مائیکروفون سے ہٹا تھا، اَور ایک دُوسرے شخص نے آ کر مزاحیہ تقریر شُروع کر دی تھی۔ لوگ اُس کے سیاسی اَور نیم سیاسی لطیفوں پر ہنس رہے تھے۔ کسی نے فلمی گانوں کی ٹیپ لگا دی۔ جس کی گھسی ہُوئی آواز بھی ساتھ ہی مائیکروفون سے خارج ہو رہی تھی۔ سٹیج کا انتظام مکمل انتشار کی حالت میں تھا۔ مختار ڈوگر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر پیچھے دیگوں کے پاس ایک پیڑھی پر سر ہاتھوں میں پکڑے بیٹھا تھا۔ دیگوں کی گرمی کی وجہ سے اُس کے ماتھے سے پسینے کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ ایک آدمی نے آ کر آہستہ سے اُس کے کان میں کچھ کہا۔ مختار ڈوگر چونک کر اُٹھا اَور کنات کا کونہ اُٹھا کر پنڈال میں داخل ہوا۔ اعجاز کے تیور دیکھ کر اُس کی گھبراہٹ میں اضافہ ہو گیا، جیسے کہ وہ اعجاز کو مدعو کرنے پر پچھتا رہا ہو۔ اعجاز کو دیکھ کر چند مزدروں نے نعرے لگانے شُروع کر دیئے تھے۔ اعجاز نے اُن کی جانب کوئی توجہ نہ دی، نہ ہی اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اُن کا جواب دیا۔

"ملک اعجاز، منظور کے بھائی کا سن کر مجھے دِلی رنج ہوا ہے،" مختار ڈوگر نے کہا، "میں جلسے کے بعد سیدھا اُس کے گھر جا رہا ہُوں۔ تم آ گئے ہو تو میرے دِل کو کچھ ڈھارس ملی ہے۔ اب تم جانو اَور جلسہ۔ یہ میرے بس کی بات نہیں۔"

اعجاز نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اَپنے خیال میں کھویا ہوا سٹیج کی جانب بڑھا۔ مختار ڈوگر اُس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ اُس کی چال سے ظاہر ہوتا تھا کہ اعجاز کو آگے بڑھانے جا

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

رہا ہو اَور ساتھ ہی اُسے روک کے بھی رکھنا چاہتا ہو۔

"رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اَور قائداعظم کے بارے میں کوئی بات نہ کرنا،" مختار ڈوگر نے اعجاز کے برابر آ کر کہا۔ "ویسے تو کسی کی کیا جُرأت کہ حضور کی شان میں کچھ کہے۔ مگر مولوی اَور لیگیئے بات کو اُلٹی طرف لے جاتے ہیں۔ یہ میرے ساتھ ہو چکا ہے۔"

اعجاز نے سٹیج پہ قدم رکھا تو مختار ڈوگر اُس کی خاموشی سے مزید گھبرا گیا۔ اُس نے اعجاز کا بازو پکڑ کر کھینچا۔

"اللہ تبارک و تعالیٰ کا ذِکر کسی بھی حساب میں کر دینا" مختار ڈوگر نے کہا۔ "وہ متنازعہ شخصیت نہیں ہیں۔ اَور لوگوں میں جوش بھی پیدا ہوتا ہے۔ بس نعرہ تکبیر کافی ہے۔"

اعجاز نے بدمزگی سے اَپنا بازو چھڑایا اَور سٹیج پر چڑھ گیا۔ چند اَور نعرے بلند ہُوئے اب اعجاز نے ہاتھ اُٹھا کر اُن کا جواب دیا اَور جا کر ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ مختار ڈوگر ایک طرف سے نِکل کر مزاحیہ تقریر کرنے والے کے سامنے جا کھڑا ہوا اَور سختی سے اُسے ہٹنے کے اشارے کرنے لگا۔ اُس شخص نے اَپنی آخری پھبتی ختم کی اَور سٹیج سے اُتر گیا۔ مختار ڈوگر نے مائیکروفون سنبھال لیا۔

"اب میں اَپنے علاقے کی جانی پہچانی شخصیت، عظیم مزدور لیڈر، پاسبانِ اِنسانیت، ملک محمد اعجاز اعوان سے، جو خاص طور سے ہماری دعوت پر آپ سب کو ڈریس کرنے کے لِئے تشریف لائے ہیں، درخواست کرتا ہوں کہ آئیں اَور آپ سے باتیں کریں۔" اُس نے ہاتھ اُٹھا کر نعرہ لگوایا۔ "ملک اعجاز اعوان۔۔۔۔" "زندہ باد" لوگوں نے جواب دیا۔ کچھ تالیاں بجیں، ایک دو مزید نعرے لگے۔ اعجاز نے اُٹھ کر مائیکروفون کی چابی ڈھیلی کی اَور اُسے اَپنے قد کے برابر اُٹھا کر چابی کَس دی۔ پھر اُس نے ہاتھ اُٹھا کر لوگوں کو خاموش ہونے کا اشارہ کیا۔

"میں آج کوئی لمبی چوڑی تقریر کرنے نہیں آیا۔ صرف، اَور صرف، "اعجاز نے دو اُنگلیاں ہوا میں اُٹھائیں،" دو باتیں کہنے آیا ہُوں۔ مگر یہ باتیں کہنے سے پہلے ایک چھوٹا سا واقعہ بیان کرنا چاہتا ہُوں۔ ابھی میں نہایت عزیز دوست کے گھر سے تعزیت کر کے واپس آیا ہُوں۔ راستے میں مَیں نے دیکھا کہ ایک علاقے میں آٹا دو کانوں سے غائب ہو گیا ہے۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"ایک نہیں ملک صاب،" مجمعے میں سے ایک آدمی چلا کر بولا، "سارے علاقوں میں ختم ہو گیا ہے۔"

"وہاں پر،" اعجاز نے اپنی بات جاری رکھی، "دُکان کے سیدھے دروازے کے آگے لوگوں کی لمبی قطار لگی تھی، جو خالی ہاتھ دھکم پیل کر رہے تھے، حالانکہ دکان کا دروازہ بند تھا۔ جب میں اُلٹی طرف سے گزرا تو دیکھتا ہوں کہ کچھ لوگ پچھلے دروازے کے راستے ایک ایک کرکے داخل ہو رہے ہیں اور آٹے کے تھیلے لے لے کر نکل رہے ہیں۔ میں آپ سے ایک سوال پُوچھتا ہُوں۔ سیدھے دروازے کے آگے دھکم پیل کرنے والے لوگ کون تھے؟"

"عوام تھے،" مجمعے سے دو تین آوازیں آئیں۔ "یہ عوام تھے۔"

"اُوں ہوں،" اعجاز نے نفی میں سر ہلایا اور ساتھ ہی اپنی دائیں اُنگلی ہلائی۔ "یہ لوگ عوام نہیں تھے۔ آپ پُوچھیں گے کہ عوام نہیں تو پھر کون تھے؟ میں کہتا ہوں کہ یہ عوام نہیں تھے۔"

ڈھائی سو آدمی بے سمجھی سے مُنہ اُٹھائے خاموش بیٹھے تھے۔

"میں آپکو بتاتا ہوں کہ کیوں یہ لوگ عوام نہیں تھے۔ پچیس سال ہو گئے ہیں، ہم سن رہے ہیں کہ عوام کے لِئے یہ ہو رہا ہے اور عوام کے لِئے وہ ہو رہا ہے۔ جو بھی حاکم آتا ہے یہی رَٹ لگاتا ہے کہ ہم عوام کی بھلائی کے لِئے آئے ہیں۔ اب دیکھئے کہ اِن پچیس سالوں میں بھلائی کِس کی ہُوئی ہے۔ بھلائی ہُوئی ہے امیروں اور کبیروں کی، افسروں اور جاگیرداروں کی، نفع خوروں اور رسہ گیروں کی، بلیکیوں اور سمگلروں کی، بدعنوانوں اور رِشوتیوں کی۔ اِن سب کی بھلائی ہُوئی ہے۔ تو پھر آپ مجھے بتاؤ کہ عوام کون ہوئے؟"

اب لوگوں کو اعجاز کی اُلٹی منطق کی کچھ کچھ سمجھ آنی شُروع ہو رہی تھی۔

"امیر اور کبیر لوگ،" ایک آواز آئی۔

"ہاں ہاں،" دُوسری آواز اُٹھی "امیر اور رسہ گیر۔"

"مل مالک،" تیسرے آدمی نے جھجکتے ہُوئے کہا۔

"درست،" اعجاز نے اُنگلی اُٹھا کر بولا۔ "آپ کی بات سو فیصدی درست ہے۔ حکومتیں جھوٹ نہیں بولا کرتیں۔ حکومتوں نے اِن لوگوں کا نام عوام رکھ دیا ہے اور پچیس

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

سال تک اِن کا فائدہ کرتی رہی ہیں۔ دکان کے سامنے خالی ہاتھ قطار میں کھڑے ہوئے لوگ عوام نہیں ہیں۔ عوام وہ ہیں جو پچھلے دروازے سے سفارشی پرچیاں لے کر آتا لے جا رہے ہیں۔ حکومتوں نے عوام کے نام اَور پتے بدل دیئے ہیں، اَور ہمیں ابھی تک پتا ہی نہیں چلا۔ میرے بھائیو، دکانوں کے سامنے دھکے کھانے والے لوگ عوام نہیں، یہ تو غریب لوگ ہیں۔"

یکایک اعجاز کے سامنے بیٹھے ہُوئے لوگوں میں بھنبھناہٹ کا شور اُٹھا، گویا مجمع جاگ اُٹھا ہو۔ درمیان سے ایک آدمی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"عوام۔" اُس نے نعرہ لگایا۔

"نامنظور،" لوگوں نے جواب دیا۔

"غریب لوگ۔"

"منظور۔"

"آج سے،" اعجاز نے ہاتھ بلند کرکے اُنہیں چپ کرایا۔ "آج سے ہمارا مطالبہ ہے کہ کوئی حکومت اَور کوئی لیڈر "عوام" کا لفظ استعمال نہ کرے۔ یہ دھوکہ دہی کا لفظ ہے۔"

اب مجمع پُوری طرح سے اعجاز کے خیال کی رو میں شامل ہو چکا تھا۔ دو چار آدمی کھڑے ہو کر نعرے لگوانے لگے۔ اُن میں سے ایک ایک بولتا، اَور مجمع جواب دیتا جاتا۔

"عوام کون؟"

"امیر کبیر۔"

"عوام کون؟"

"رسہ گیر۔"

"عوام کون؟"

"رشوت خور۔"

"عوام کون؟"

"بدعنوان۔"

"عوام کون۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"مل مالک۔"

"بولو، عوام۔"

"نامنظور۔"

"غریب۔"

"بے قصور۔"

"غریب۔"

"منظور، منظور۔"

اِس نئے اَور نامانوس نعرے کو سن کر دیگیں پکانے والا عملہ کناتوں کے کونوں کناروں سے سَر نکالے کھڑا دیکھ رہا تھا۔ کنات کے ایک بانس کے ساتھ لگ کر مختار ڈوگر مُنہ کھولے کھڑا تھا۔ اعجاز چند لمحوں تک خاموش کھڑا اِن نعروں کو سنتا رہا، پھر اُس نے ہاتھ اُٹھا کر اُنہیں خاموش کرایا۔

"اب دُوسری بات،" وہ بولا، "پچیس سال سے ہم حکومتوں کی بات سنتے آئے ہیَں کہ یہ ہو جائے گا وہ ہو جائے گا اَیسا کر دیں گے، ویسا کر دیں گے۔ یہ گا گے، گی سنتے سنتے ہمارے کان پک گئے ہیَں۔ ہم پُوچھتے ہیَں کہ یہ کب ہو گا اَور وہ کب ہو گا اَیسا کب کریں گے اَور ویسا کب کریں گے؟ ہم ترس گئے ہیَں یہ سننے کے لِئے یہ ہو گیا ہے، وہ ہو گیا ہے۔ اَیسا ہو گیا ہے اَور ویسا ہو گیا ہے۔ درست، یا نادرست؟"

"درست۔ درست۔" مجمع چلایا۔

"اِس لِئے ہمارا دُوسرا مطالبہ یہ ہے: آج کے بعد کوئی حکومت، اَور کوئی لیڈر، گا گے، اَور گی کے لفظ استعمال نہ کرے۔ یہ بھی دھوکہ دہی کے اَلفاظ ہیَں۔"

"دھوکہ دھوکہ، جھوٹ جھوٹ،" نعرے لگانے والوں نے کہا۔

"آج کے بعد،" اعجاز نے کہا "حکومت کے ہر بیان میں "ہے" کا لفظ برتا جائے۔ یہ سچا لفظ ہے۔"

اب تقریباً آدھے لوگ اُٹھ کھڑے ہُوئے تھے۔ اُنہوں نے دوبارہ نعرے لگانے شُروع کر دیئے۔

"گا گے، گی۔"

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

"نامنظور۔"

"گا، گے، گی۔"

"جھوٹ فریب۔"

"گا، گے، گی۔"

"دھوکا چلاکی۔"

"ہے، ہے، ہے۔"

"منظور، منظور۔"

"گا، گے، گی۔"

"بے اصل۔"

"ہے، ہے، ہے۔"

"اصل اصل۔"

"اِس کے بعد نعرے لگوانے اَور جواب دینے والوں نے انہیں مختصر اَور آسان کرنے کی خاطر صرف ایک ہی گردان شروع کر دی۔

"ہے ہے ہے۔"

"ہے ہے ہے۔"

"ہے ہے ہے۔"

"ہے ہے ہے۔"

اس آواز میں ایک عجیب تان تھی، جس کا علم اعجاز کو بھی اسے سننے کے بعد ہوا۔ اس میں لہو گرمانے والی لبیک، للکار کی لے، دلاوری کی ہاہاکار تھی۔

"ہے ہے ہے،" آواز اُٹھتی۔

"ہے ہے ہے،" سینکڑوں آوازوں کا جواب ملتا۔

"ہے ہے ہے۔"

"ہے ہے ہے۔"

یوں معلوم ہوتا تھا جیسے یہ سلسلہ دِن بھر چلتا رہے گا۔ عام حالات میں یہ منظر دیکھ کر اعجاز کے خُون کی گردش میں تیزی آ جاتی اَور دِل کا خانہ پھَیل کر سینے کو بھر لیا کرتا تھا۔

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

مگر اس وقت وہ منظور جیسے وفادار کے گھر سے اُس کے بھائی ریاض کی چارپائی سے اُٹھ کر آیا تھا جہاں چار آدمیوں نے ریاض کو بازوؤں اَور ٹانگوں سے پکڑ کر قابو میں رکھا ہوا تھا اَور وہ واہی تباہی بک رہا تھا۔ منظور زمین پہ بَیٹھا تھا اَور اُس کے آنسو نہ تھمتے تھے۔ گھر کے اندر سے عورتوں کے بین کی آواز آ رہی تھی۔ اعجاز کی آنکھوں کے سامنے سے یہ منظر نہ ہٹتا تھا۔ اُس کی روح میں ایک عمیق افسردگی سرائیت کر گئی تھی اَور دِل پر ایک من وزنی رنج کا بوجھ تھا۔ مجمعے کی ہے ہے سن کر اُس کے چہرے پر فتمندی کے آثار پیدا نہ ہُوئے۔ اُس نے سنجیدگی سے ہاتھ اُٹھا کر لوگوں کو خاموش کرایا۔ مختار ڈوگر نے موقع دیکھ کر سرعت سے کام لیتے ہُوئے ایک طرف سے کناتیں اُٹھوا دیں جہاں کھانے کی میزیں لگی تھیں۔ میزوں پر المونیم کی پلیٹوں کے انبار تھے۔ اُس نے ہاتھ کے تیز تیز اشاروں سے لوگوں کی توجہ میزوں کی جانب مبذول کرائی۔ لوگ اُس راستے سے گزُر کر میزوں پہ رکھی نمکین چاولوں کی پراتوں پر ٹُوٹ پڑے۔ اعجاز ایک طرف سے باہر نِکل گیا۔ پہلے وہ دو چار قدم اَپنے دفتر کی جانب بڑھا۔ پھر پلٹ کر اُس نے سائیکل کا رخ گھر کی جانب موڑ دیا۔

یونینوں کے اندر افواہیں کئی روز سے گردش کر رہی تھیں، مگر نہ اُن کا کوئی سرا ہاتھ میں آتا تھا، نہ کوئی وجہ معلوم ہوتی تھی۔ بس گول مول سی بات کہیں سے نِکل کر آہستہ آہستہ پھیلتی جا رہی تھی کہ اِدھر اُدھر سے پُوچھ گچھ ہو رہی تھی اَور اعجاز کو اُوپر سے کوئی بلاوا آیا تھا یا آنے والا تھا۔ کئی کا خیال تھا کہ اُسے انعام کے طور پر کوئی اعلیٰ پوزیشن ملنے والی تھی۔ دُوسروں کا اندازہ اس کے برعکس تھا۔ سب کو معلوم تھا کہ اعجاز نے منظور کے بھائی کے معاملے میں چوک کے اندر کھڑے ہو کر ڈی۔ایس۔پی کا نام لے کر گالیاں دی تھیں اَور ایس۔ایچ۔او کو سرعام چیلنج کیا تھا کہ اگر اُسے گرفتار کرنا چاہتا ہے تو آئے اَور کرے، چنانچہ کسی نہ کسی حد تک وہ سرزنش کا مستحق قرار دیا جا رہا تھا۔ اعجاز کے پاس یہ افواہیں پہنچ رہی تھیں، اَور سیاست کی رو سے اُسے علم تھا کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ مگر ان

Courtesy www.pdfbooksfree.pk

دنوں اُس کے دل میں تشویش کی صورت پیدا نہ ہو رہی تھی جو پہلے ہوا کرتی تھی۔ جب سے منظور کام چھوڑ کر کل وقتی طور پر اَپنے بھائی کی دیکھ بھال میں لگ گیا تھا، اعجاز کا جی اُچاٹ رہنے لگا تھا۔ منظور کے ساتھ اُس کی وابستگی نہ طوالت وقت کے باعث تھی، نہ منظور کی کارکردگی کی وجہ سے تھی۔ صرف منظور کی وفاداری کی ایک خاص صورت تھی جو اعجاز کے دِل میں راہ پا گئی تھی۔ اُس کے لِئے منظور دفتر کا ایک ملازم نہ رہا تھا بلکہ قریبی عزیز کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔

دو ہفتے کے بعد اعجاز طلبی کا پروانہ ہاتھ میں پکڑے ملتان کے سٹیشن پر اُترا۔ تین روز پہلے اُسے پیپلز لیبر فیڈریشن کی جانب سے خط موصول ہوا تھا۔ اسسٹنٹ جائینٹ سیکرٹری بی۔اے چوہدری دورے پر ملتان پہنچ رہے تھے۔ اُن سے جا کر ملنے کا حکم درج تھا۔ خط پر منسٹری آف لیبر کے ایک سیکشن افسر کے کاؤنٹر سائن بھی موجود تھے۔ اعجاز نے شہر کے صدر دفتر سے پتا کیا۔ بی۔اے چوہدری کو کوئی نہ جانتا تھا۔ صرف ایک آدمی نے بتایا کہ اِس شخص کی ابھی ابھی تعیناتی ہُوئی ہے، مگر اس سے پہلے ایک آدھ بار کراچی وغیرہ میں لیبر کو آرگنائز کرنے کے سلسلے میں ان کا نام سننے میں آیا تھا۔ تفصیل سے کوئی بھی آگاہ نہ تھا۔ ایک ہی دِن کے اندر یہ خبر سارے علاقے میں پھیل گئی کہ ملک اعجاز ملتان میں افسران سے ملنے جا رہے ہیں۔ سب لوگ نتیجے کے اِنتظار میں تھے۔

اعجاز کو کہیں دُور نہ جانا پڑا۔ سٹیشن کے ساتھ ہی ریلوے یونین کے دفتر میں بی۔اے چوہدری اَور اُن کے سٹاف کو دو کمرے دے دیئے گئے تھے، جہاں تین روز تک اُن کا قیام تھا۔ اعجاز پُوچھتا ہوا وہاں جا پہنچا۔

"یہ بی۔اے چوہدری صاحب کا کمرہ ہے؟" اُس نے پُوچھا۔

"سیکرٹری صاحب؟ جو کراچی سے آئے ہیں؟"

"ہاں۔"

"آپ ملنا چاہتے ہیں۔"

"ہاں۔ میں لاہور سے آیا ہُوں۔"

"یہی کمرہ ہے۔ اُن کے پاس کچھ آدمی بیٹھے ہیں۔ مگر آپ اندر چلے جائیں۔"

اعجاز نے دروازہ کھول کر کمرے میں قدم رکھا۔ دروازے کے عین سامنے چوڑی